© rasailojaraid.com

ان سب کی حمایت اور اعانت اردو کار کے لیے حاصل کی جاتی۔ پھر اردو کے تعلیم بالغان کا بندوبست پورے ملک میں ہوتا۔ بچوں اور بچیوں کو اردو سکھانے کی آسان کتابیں کثرت سے شائع ہوتیں۔ نصاب کی کتابوں کی فراہمی۔ اساتذہ کا بندوبست اردو پرائمری مدارس کا قیام اور ان کا نظم ونسق فلم انڈسٹری سے ربط وضبط۔ سیاسی جوڑ توڑ:۔ اردو اخبارات کی توسیع اشاعت اردو ٹائپ کے اعلیٰ انتظامات۔ انگریزی اور ہندی کے اخبارات ورسائل میں اردو زبان وادب اور اردو کے مسائل ومعاملات پر کثرت سے مضامین شائع کرنا۔ ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں سے اردو کے علائق وروابط قائم کرنا غرض کہ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جو اردو تحریک کے اجزا ہیں۔ انجمن ترقی اردو ان میں سے کوئی ایک کام بھی قابل ذکر طور پر نہیں کر رہی ہے اور عملاً صرف ایک ادارۂ نشر واشاعت ہو کر رہ گئی ہے۔ ہائے غضب۔ راقم الحروف کی ایک غزل کا شعر ہے:۔ ؎

گزری ہی نہیں جیسے کوئی سر پہ قیامت
یوں لب بہ سئے بیٹھے ہیں نہ شکوہ نہ شکایت

ہمارے ہاں عام قاعدہ یہ ہے کہ اس طرح کے جماعتی کاموں کی ابتری اور زبوں حالی کی ذمہ داری تنہا ایک شخص کے سر ڈال دی جاتی اور اس کو ہی مسئول قرار دیا جاتا ہے یہ بات اصولاً غلط ہے۔ جب وہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے تو اس کے کاموں کی مسئولیت بھی تنظیم کے جملہ ارکان واعضاء پر عائد ہوتی ہے سخت حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ آج تک اردو کے ان ارکان واساطین کو یہ کیوں محسوس نہیں ہوا کہ ۔

(۱) مرکزی انجمن کا دفتر علی گڑھ میں ہرگز نہ رہنا چاہیے۔ جہاں کی آب وہوا جذبۂ عمل اور دلولۂ کار کو راس نہیں آتی۔

(۲) انجمن کا سکریٹری اس شخص کو ہونا چاہیے جو بالکل آزاد ہو جری اور بیباک ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جو چوبیس گھنٹے انجمن کے کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کرے۔

(۳) انجمن کا سکریٹری آنریری نہ ہو بلکہ معقول اور حسب حیثیت مشاہرہ پر ملازم ہو۔

(۴) اس کے پاس اتنا فنڈ ہونا چاہیے کہ وہ پورے ملک کا دورہ کرتا رہے۔

(۵) اس کو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کا بھی ادیب اور انشا پرداز ہونا چاہیے۔

(۶) سکریٹری کے ساتھ کم از کم پانچ پانچ سو روپیہ ماہوار پر دو اور شخص ہونے چاہئیں جو علمی اور ادبی کاموں کے ساتھ تحریک کے کاموں میں بھی اس کے ممد و معاون ہوں جیسے مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ پنڈت دتاتریہ کیفی اور سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ اگر اب تک انجمن کا کام اس نہج پر ہوا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں آج اردو کا کام بہت سہل ہو گیا ہوتا اور وہ وقت آ گیا تھا جب اندرا جی کی قیادت میں حکومت اردو کو اس کا حق دینے کا فیصلہ کر دیتی اور ہمارے نزدیک فخرالدین احمد صاحب نے اردو والوں کی اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب اگر یہ کام نہیں ہوا تو یہ ماتم فقط ایک انجمن اور اس کے اعیان و ارکان کا ماتم نہیں ہے بلکہ یہ ماتم ہے اس بدنصیب قوم کا جو دنیا بھر میں شور مچاتی رہتی ہے اردو یونیورسٹی کے خواب میں بدمست رہتی ہے لیکن جو کام کرنے کا ہے اس کی طرف دھیان نہیں دیتی اس نے گورنمنٹ کی گرانٹ پر انجمن کے زندہ رہنے پر قناعت کر لی اور خود کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ انجمن کا اصل کام کیا ہونا چاہیے اور یہ کام کس طرح انجام پذیر ہو سکتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اردو کا مسئلہ مسلمان جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا اور اس سے اردو کاز کو نقصان پہنچا۔ اب حکومت اردو کے لیے جو کچھ کر رہی ہے وہ نیم شعوری طور پر اس کو خالص مسلمانوں کا معاملہ سمجھ کر کر رہی ہے۔ اس صورت حال نے سلجھانے کے بجائے معاملہ کی اصل پوزیشن کو کمزور بنا دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

سرسید کے حالات و سوانح کا مطالعہ جس شخص نے بھی کیا ہے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید میں دو وصف خاص طور پر تھے۔ ایک یہ کہ وہ ہر معاملہ میں انتہا پسند تھے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تھے تو ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ چیز اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ کسی درمیانی درجہ پر قناعت کرنا ان کی فطرت اور طبیعت کے خلاف تھا اور دوسرے یہ کہ ان کی طبیعت میں ضد اور ہٹ بھی تھی[1]۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے تو اب کوئی لاکھ ان کی مخالفت کرے ان کو مطلق پروا نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنے ڈگر پر قائم رہتے تھے۔ یہ دونوں وصف محمود بھی ہیں اور مذموم بھی۔ اگر ان کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو فی نفسہٖ اچھی ہو اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلیں تو یہ محمود ہیں ورنہ مذموم! عجیب بات ہے، سرسید کی زندگی میں ان وصفوں کے محمود اور مذموم دونوں ہی رخ نظر آتے ہیں۔ اور غالباً یہ انھیں کی خصوصیت نہیں دنیا کے ہر بڑے انسان کا جوہر طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے۔

---

[1] اس کا اعتراف مولانا حالیؔ نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ بےشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خود رائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا (حیات جاوید حصہ دوم ص ۸۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کالج میں انگریز اساتذہ چنانچہ جب سرسید نے یہ طے کر لیا کہ (۱) کالج میں انگریزی علوم جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کرنا ہے اور (۲) مسلمان نوجوانوں کو حکومت کے دفاتر میں کھپانے کی غرض سے حکومت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنا ہے تو اب ایک طرف تو انھوں نے کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھوایا۔ جو اس زمانے میں وائسرائے تھے اور اس موقع پر سرسید نے جو ایڈریس پیش کیا اس میں فرمایا۔ ہمارے راستہ میں جو دشواریاں حائل رہی ہیں اور اس میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کے پیش نظر ہم کو یقین ہے کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے اور خود اپنے ہم وطنوں سے بھی وہ امداد اور تائید حاصل کرتے رہیں گے جن کے باعث یہ کالج ایک دن یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا اور اس یونیورسٹی کے فرزند آزاد تحقیقات، وسیع القلب رواداری اور بے میل اخلاق کا وعظ ملک کے طول و عرض میں کہتے پھریں گے۔

اور دوسری جانب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ کالج میں ایک معقول تعداد یورپین اساتذہ کی بھی رہے گی جن کو بیش قرار تنخواہ کے علاوہ تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ جو یورپین طریق زندگی کے لیے ضروری ہیں، چنانچہ کالج کے اسٹاف میں (ہیڈ ماسٹر کی جگہ کو بھی شامل کرکے) یورپین اساتذہ میں جو نام نمایاں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں۔ پرنسپل بیک، پروفیسر مارلیسن۔ پروفیسر آرنلڈ۔ پروفیسر والس۔ مسٹر ہورسٹ۔ مسٹر ڈینیٹن۔

سرسید کی دور اندیشی کی داد دینی چاہیے کہ یورپین اسٹاف سے صرف ایک اعلیٰ تعلیم کا فائدہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ذریعہ گورنمنٹ کا اعتماد بھی حاصل ہوتا تھا ورنہ اس وقت جو حالات تھے اور مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو جو شکوک و شبہات تھے ان کی وجہ سے بعید نہ تھا کہ انگریز اس کالج کو جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کے افراد بیک وقت اس کثرت سے مجتمع ہو گئے تھے، شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے اور انھیں خیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا کہ کالج کہیں انگریزوں کے خلاف کسی تحریک کا مرکز تو نہیں ہے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔ یہ مدرسہ انگریزوں کی نگاہ میں ہمیشہ مشکوک و مشتبہ رہا اور شروع میں اس کے بعض مخالفوں نے انگریزوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ مدرسہ میں جہاد کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے تہ خانوں میں برابر ہتھیار چلانا سکھایا جاتا ہے حکومت کی جانب سے متعدد بار اس کی تحقیق و تفتیش بھی ہوئی۔

یورپین اساتذہ کی خدمات حسنہ جیسا کہ آپ کو آئندہ چل کر معلوم ہوگا۔ اگرچہ سرسید کی زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی مخالفت بڑے شدومد کے ساتھ ہوئی تو مخالفت کی وجوہ میں ایک وجہ کالج کا یورپین اسٹاف اور سرسید کا ان پر غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ بھی تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک تعلیم، ڈسپلن اور حسنِ انتظام کا تعلق ہے سرسید کا یہ اقدام نہایت مستحسن، قابلِ ستائش اور بالغ نظری پر مبنی تھا۔ آج بھی جیسا کہ ہم سو برس آگے بڑھ آئے ہیں، ہمارے ملک میں اسّی سے اوپر یونیورسٹیاں اور بیسیوں خاص خاص شعبوں میں مہارت اور تخصیص کے ادارے اور انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں۔ ہمارے بچے اور بچیاں انگلش اسکولوں میں تعلیم پانے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ امریکہ یا کناڈا وغیرہ بھیجے جاتے ہیں، آج ہمارے ملک میں تعلیم کی ابتری اور طلباء کی بے راہ روی کی جو شکایات عام ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے اساتذہ عموماً اپنے مضمون اور اپنے فرائض منصبی سے زیادہ یونیورسٹی کی سیاست اور اپنے ذاتی مفادات و اغراض سے دلچسپی رکھتے اور ان کے شب و روز اسی ادھیڑ بن میں گزرتے ہیں۔ نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مغربی ملک کا حال بالکل اس کے برعکس ہے وہاں جو کوئی شخص بھی تعلیم کی راہ اور علم کا پیشہ اختیار کرتا ہے کسی خارجی دباؤ یا روپیہ کا لالچ یا عہدہ و منصب کی خواہش کے بجائے محض اپنے ذوق اور علم و تحقیق کے میدان میں تاخت کے شوق اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلولہ نسے کرتا ہے کس بنا پر وہ فنا فی العلم ہوتا ہے اس میں اخلاص عمل. کردار کی پختگی. اور دنیوی راحت و آسائش اور عہدہ ومنصب سے بے نیازی کے اوصاف ہوتے ہیں اس کا شب و روز کا مشغلہ مطالعہ وتحقیق اور طلباء کی نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ تعلیم وتربیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔[1] اس بنا پر سرسید نے اگر اس وقت اعلیٰ تعلیم کے

---

[1] عرصہ ہوا ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور نے انگلینڈ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد لاہور واپس آکر "معارف" اعظم گڑھ میں ولایت سے متعلق اپنے تاثرات پر ایک مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے ایک موقع پر یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ شام کو میں اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ (W.T. ARNOLD) کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ بے تکلف بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک پروفیسر آرنلڈ بولے: "اچھا عنایت اللہ بتاؤ! اس وقت تمہارے دل میں سب سے بڑی تمنا کیا ہے. اس کا جواب فوراً دو سوچنے کی اجازت اور مہلت نہیں ہے"۔ شاگرد نے کہا: "میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میرے پاس اتنی دولت ہو کہ تمام دنیا کی خوب سیاحت کروں"۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ جواب سنا تو ان کا چہرہ اتر گیا. دانتوں میں انگلی دبالی اور بولے: "عنایت اللہ مجھ کو تمہارے جواب سے بڑا دکھ ہوا ہے. تم کیسے طالب علم ہو جو دولت کی تمنا کرتے ہو. ایک حقیقی طالب علم کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو تو علم میں ترقی ہی ہونی چاہیے۔ یہ پروفیسر آرنلڈ وہی بزرگ ہیں جو سرسید کے زمانہ میں محمڈن کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے. ان کی متعدد نہایت وقیع تصنیفات کے علاوہ "دی پریچنگ آف اسلام" جس کا اردو ترجمہ سرسید کے حکم سے محمد عنایت اللہ صاحب دہلوی نے دعوتِ اسلام کے نام سے کیا تھا. ایک نہایت بلند پایہ اور تاریخ ساز کتاب ہے انہوں نے علی گڑھ میں مولانا شبلی سے عربی اور مولانا شبلی نے ان سے فرنچ پڑھی تھی. علی گڑھ سے منتقل ہو کر جب لاہور گورنمنٹ کالج میں چلے گئے تو وہاں ڈاکٹر اقبال ان کے شاگرد ہوئے. انہیں پروفیسر آرنلڈ کا ایک حد درجہ سبق آموز واقعہ مولانا شبلی نے اپنے سفرنامۂ مصر و روم وشام میں لکھا ہے. اسے بھی سن لیجیے. شاید کوئی عبرت ہو۔ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی دونوں ایک جہاز سے سفر کر رہے تھے. عدن کے قریب ایک مقام پر جہاز کو (جرمنی کے جہاز ایمڈن کے نظر آجانے کے باعث) شدید خطرہ لاحق ہو گیا. مسافروں کے اوسان خطا ہو گئے. اس حالت میں مولانا شبلی بھاگے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے کیبن میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں موصوف پڑھنے

(باقی صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے یورپین اساتذہ کی خدمات کو حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو کوئی شبہ نہیں ان کا یہ فیصلہ غایت درجہ کی حقیقت پسندی عالی ہمتی اور بلند نظری پر مبنی تھا اور اس سے کالج کے مقاصد کی تکمیل باحسن وجوہ ہوئی۔ اس زمانہ میں کالج کے حالات کا مبصر اور اس کے اچھے بُرے کا ناقد مولانا حالی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ جو بیش قرار تنخواہیں یورپین عہدہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یورپین اسٹاف نے اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے ان کو کالج کا جزوِ اعظم قرار دیا ہے وہ باوجود قومی مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمڈن کالج کو اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے طلباء کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں ان کی مجلسوں اور مباحثوں میں خود بھی شریک ہوتے ہیں . . . . اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں . . . . وہ طرح طرح سے ان کو غیرت دلاتے ہیں اور ان کی غفلت کے نتائج سے ان کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں،

اطمینان سے کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں مولانا کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا کیا آپ کو خبر نہیں ہے کہ جہاز خطرہ میں ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے کہا۔ جی ہاں! مجھے اس خطرہ کا علم ہے۔ مولانا بولے تو پھر اس کے باوجود یہ اطمینان! پروفیسر آرنلڈ بولے مولوی شبلی! اس وقت ہم جس حالت میں ہیں اس کے انجام دو ہیں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ خطرہ ٹل جائے گا اور جہاز اس سے صحیح سلامت باہر نکل آئے گا اور یا جہاز تباہ و برباد ہو جائے گا اور ہم سب مر جائیں گے۔ اگر پہلی صورت مقدر ہے تو پھر خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کیا فائدہ اور اگر دوسری صورت۔ مگر تقدیر میں مر جانا ہی لکھا ہے تو عمر عزیز کے جو یہ چند لمحات باقی ہیں انھیں کیوں نہ کسی بہتر کام میں صرف کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کتاب کے مطالعہ سے زیادہ بہتر کام اور کون ہو سکتا ہے؟؟؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالبعلموں کی امداد اور تقویت طرح طرح سے کرتے ہیں، بیماروں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ تمام انتظامات اور طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ کرتے جاتے ہیں۔"

یہ سب کچھ تو کالج میں انتظام، ڈسپلن اور لڑکوں کی نگرانی اور حوصلہ افزائی سے متعلق تھا۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ لڑکوں کی مذہبی پابندی میں بھی ان یورپین اساتذہ کا کیا رول تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں۔

"وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں، مسجد کی غیر حاضری پر ان کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی ان کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور ان کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔"

(حیات جاوید حصہ دوم ص ۸۴)

مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری سرسید کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یورپین اساتذہ کی حسن کارگزاری کے ثناخوان وہ بھی ہیں لکھتے ہیں:-

"سرسید کے انتقال کے بعد مسٹر بیک نے سرسید میموریل فنڈ اور کالج کی ترقی کے لیے حد درجہ کوشش کی اس سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ ہر چند انھیں کام سے منع کیا گیا، مگر بیماری کی حالت میں جب کہ وہ تعطیلات کے زمانہ میں شملہ میں تھے۔ کام کرتے رہے حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرتھیوڈور ماریسن نے نہ صرف تعلیمی کام بلکہ انتظامی کام حد درجہ کی تن دہی سے انجام دیئے۔ طلباء کی ملازمت کی ایجنسی قائم کی۔ اپنے غیر معمولی رسوخ سے جو انھیں حکام کے حلقہ میں حاصل تھا، طلباء کو سرکاری ملازمتیں دلواتے تھے۔ کالج کے تمام طلباء کے لیے وہ بمنزلہ بزرگ خاندان کے تھے۔ جو نہ صرف طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ ان کی کاروباری زندگی میں ہر دم یکساں مددگار رہتے تھے۔ دورانِ ملازمت میں اپنے شاگردوں کی ترقی و بہبود میں برابر ساعی رہتے تھے اور مصیبت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ مسٹر ماریسن (جو بعد میں سر ہوئے) کے زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ صرف چلت پھرت اور کھیل کود اور نمائش میں بلکہ تعلیم میں بھی علی گڈھ کے طلباء بہت نمایاں تھے۔ اور نتائج کے اعتبار سے الہ آباد یونیورسٹی میں اونچے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً تمام یونیورسٹی میں اول آتے تھے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کالج کے سابق طلباء کو اپنی مادر درس گاہ سے وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا پرنسپل بیک، مسٹر ماریسن اور مسٹر آرنلڈ اور اسی زمانے کے انگریز استادوں کے سر تھا، یہ اساتذہ طلباء کی مختلف انجمنیں بنانے، انہیں منظم کرتے۔ ان سے پدرانہ برتاؤ کرتے۔ کالج چھوڑنے کے بعد ان سے مستقل تعلقات رکھتے۔ ان کے سالانہ جلسے اور ڈنر منعقد کرتے اور ان کے ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کراتے تھے۔ کالج کے لیے چندہ جمع کرانے کے تمام کام جو انگریز استادوں نے کیے وہ سب انھیں کے ایجاد تھے جو انہوں نے درجۂ کمال پر پہنچا دیے۔ انہیں کی بدولت یہاں کے پڑھے ہوئے طلباء کی ایک مستقل برادری قائم ہو گئی جنہوں نے علی گڈھ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور علی گڑھ کالج تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا۔"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل باب پنجم ص ۲۲۱ - ۲۲۳)

جب کوئی شخص قوم کا عظیم لیڈر اور قائد ہوتا ہے تو وہ صرف خود بڑا نہیں ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ اس کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش ایسے رفقائے کار کا ایک حلقہ مہیا کر لیتا ہے جو اس کے کاموں میں اس کے دست و بازو ہوتے اور اس کے مشن کی تکمیل میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی سرسید کی شخصیت کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ قیادت کے دوسرے اوصاف دکمالات کے ساتھ قدرت نے اس وصف خاص میں بھی ان کے ساتھ بڑی فیاضی کا معاملہ کیا تھا۔ یہ ان کی بالغ نظری، روشن دماغی اور نگاہِ انتخاب کا غیر معمولی کمال ہے کہ انہوں نے کالج کے یورپین اسٹاف کے لیے انتخاب کیا بھی تو ایسے لوگوں کا کیا جو حسب ونسب کے اعتبار سے شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے، کیمبرج یا آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے اور اخلاق وعادات کے لحاظ سے یورپین سوسائٹی کے بہترین افراد کہے جا سکتے تھے چنانچہ انھوں نے سرسید کے مشن کی نہ صرف یہ کہ حمایت کی بلکہ کامل خلوص وہم آہنگی اور تن دہی کے ساتھ اس مشن کو کامیاب بنانے کی جد وجہد میں لگے رہے۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ مولانا حالی نے چند واقعات کی روشنی میں لکھا ہے، کالج کے سب لوگ اور خصوصاً طلباء اپنے ان شفیق اساتذہ پر جان چھڑکتے تھے اور جب کوئی وہاں سے رخصت ہوتا تھا تو طلباء دل کی گہرائیوں میں اس کی جدائی کا غم محسوس کرتے تھے۔

اس موضوع پر اس تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے زمانہ کے بعض سیاسی لغت نویسوں کے نزدیک ہر وہ کام جس میں انگریز سے مدد لی گئی ہو اور اس سے استفادہ کیا گیا ہو انگریز پرستی ہے اور قومیت کی ضد۔ اس کے برخلاف ہر وہ چیز جو انگریز دشمنی میں کی گئی ہو وہ عین قوم پرستی اور نیشنلزم ہے، چنانچہ محمڈن کالج علی گڑھ کے یورپین اسٹاف کا بھی معاملہ ہے، جس کی بنیاد پر آج کل کے بعض مدعیانِ قوم پروری ارباب قلم (ہندو اور مسلمان دونوں) نے سرسید کو انگریز پرستی اور قومی دھارے سے علیحدگی کے طعنے دیئے ہیں اور ان کو بُرا بھلا کہا ہے۔ چنانچہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حال ہی میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۲ء کے سلسلہ میں روزنامہ اسٹیٹسمین میں اس کے نامہ نگارِ خصوصی کا جو ایک دو کالمی مضمون شائع ہوا ہے اس میں مقالہ نگار نے دیوبند اور علی گڑھ کا موازنہ کرتے ہوئے سرسید کی نسبت اسی الزام کو دہرایا ہے ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو وہ پوری دنیا کو اپنی زمین اور دنیا کے تمام انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے، حکمت اس کی متاعِ گمشدہ ہے وہ اگر چین میں بھی ہو (جس سے آج کل ہندوستان کے تعلقات خراب ہیں) تو ایک مسلمان کو اس کو وہاں سے حاصل کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ سرسید کی انتہا پسندی کے باعث ان سے کچھ فروگزاشتیں اور بے اعتدالیاں ضرور ہوئیں۔ جنہیں ہم خود آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن سرسید پر یہ الزام سرتاسر غلط اور بہتانِ عظیم ہے کہ وہ انگریز پرست یا حکومت پرست تھے، انگریزوں کے خوشامدی اور ان سے مرعوب تھے اور قوم پروری اور وطن دوستی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔

سرسید کی تحریک کا نیا موڑ | دنیا میں کسی بھی تحریک کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے اس کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ گردشِ لیل و نہار اور انقلابِ روزگار کی وادیوں سے اسے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کامیاب ہوتی اور سوسائٹی میں کوئی انقلاب پیدا کرتی ہے تو اس کے ابتدائی عہد میں تحریک کے تمام اعضا و ارکان میں یک جہتی اور اتحاد ہوتا ہے اگر کوئی وجہ مخالفت کی ہوتی بھی ہے تو بانیٔ تحریک کی بھاری بھرکم شخصیت کے زیر اثر شکوہ زیر لب ہو کر رہتا ہے۔ لیکن تحریک کی کامیابی پر جب ایک مدت گزر جاتی اور اس کے اثرات و ثمرات بین طور پر محسوس و مشاہد ہونے لگتے ہیں تو اختلاف و عدم توافق کی صدائیں جو کل تک زیر لب تھیں اب زبان پر بے محابا آ جاتی ہیں اور ہر تحریک کے لیے یہ وقت سخت کرائسس (CRISIS) اور ابتلا کا ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریکوں میں یہ دور عام طور پر بانی تحریک کے انتقال کے بعد آتا ہے۔ لیکن سرسید کی بدقسمتی ان کی تحریک کا یہ صبر آزما اور حوصلہ شکن دوران کی زندگی میں ہی آگیا۔

اسباب و وجوہ | اس کے وجوہ و اسباب اگرچہ متعدد ہیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، سرسید کی طبیعت میں ہر بڑے انسان کی طرح جس سے پیغمبر ہی معصوم ہوتے ہیں بلا کی انتہا پسندی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے احتیاطی کا صدور ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے کالج میں یورپین اسٹاف کی موجودگی کو بطور ایک اصلِ کل اور پالیسی کے اختیار کیا تو ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادی کہ کالج کا پرنسپل اور ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر دونوں انگریز ہی ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کالج کا مکمل نظم و نسق اور دروبست ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جو حضرات ایشیا اور افریقہ میں برطانوی مستعمرات کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان مستعمرات میں حکومت کی پالیسی اور انگریز کا کیرکٹر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ جس قوم اور فرقہ میں رہتے ہیں ان میں گھل مل کر اور ان کو اپنا بنا کر رہتے ہیں۔ تعلیم، انتظام، صحت، صفائی اور ڈسپلن اس میں سے ہر میدان میں خلوص اور محنت سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس ملک اور قوم کی زبان اور ان کے علوم و فنون کو ترقی دیتے اور اس کے لیے جانفشانی سے کام کرتے ہیں، لیکن ان تمام خدمات کے باوجود یہ لوگ اپنا اساسی مقصد کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان تمام خدمات کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے دل میں حکومت کے ساتھ وفاداری کا ولولہ اور جوش پیدا کیا جائے اور محکوم کے دل میں حکمران طبقہ کی عظمت اس کی تہذیب و تمدن کی سربلندی اور اس کے احسانات کے لیے شکر گزاری و منت پذیری کے جذبات و احساسات پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد انگریزوں کے دورِ حکومت میں عربی فارسی اور سنسکرت کے خصوصاً اور دوسرے مضامین کے عموماً انگریز محققین و فضلا کا ہم کو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عظیم گروہ نظر آتا ہے جنہوں نے بے شبہ ان علوم وفنون کی بڑی قابل قدر اور لائق تحسین خدمات انجام دی ہیں اور ان سے ہندوستان کو بڑا فائدہ پہنچا اور اب تک پہنچ رہا ہے لیکن بایں ہمہ یہ سب حضرات ڈپلومیٹ بھی تھے۔ اور انھوں نے اپنا سیاسی مقصد ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں کیا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن عربی فارسی کے نہایت بلندپایہ استاد اور محقق تھے، لیکن ساتھ ہی برطانوی حکومت کے محکمۂ خارجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرڈینی سن راس جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے انھوں نے عربی، فارسی، علوم وفنون کی جو عظیم خدمت کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موصوف اوّل درجہ کے ڈپلومیٹ یا دوسرے لفظوں میں حکومت کے سیاسی ایجنٹ بھی تھے چنانچہ خاص ایران کے معاملہ میں انھوں نے حکومتِ ہند کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ایران میں برطانوی سیاست کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

افسوس ہے سرسید اپنی انتہا پسندی اور عجلت میں کالج کے پرنسپل اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص کرتے وقت اس اہم نکتہ کو نظر انداز کر بیٹھے۔ جلد یا بدیر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یورپین اسٹاف اور کالج کے عمائد و زعما میں تصادم اور تزاحم پیدا ہوا اور کالج کا شیرازۂ جمعیت و اطمینان پراگندہ و پریشان ہو۔

<u>یورپین اساتذہ کے ناگوار اثرات</u> چنانچہ اس صورتِ حال کے باعث جو حالات پیدا ہوئے انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:۔

الف:۔ مسلمان طلبا میں انگریز قوم کی عظمت ہی نہیں، جذباتی طور پر ان سے ایک لگاؤ پیدا ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ انگریزی تہذیب وتمدن کے زیادہ گرویدہ اور فریفتہ ہوگئے۔ ان کے لیے اپنی مادری زبان میں گفتگو کرنا مشکل تھا۔ انگریزی میں بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ اپنی قومی اور ملی تہذیب سے ان کو عار آتی۔ لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے طور طریق اور معاشرت کے آداب و رسوم ان سب میں یورپ کی تقلید ان کے لیے باعث فخر اور سرمایۂ ناز تھی۔ یورپین اساتذہ کے ساتھ ہر وقت کے خلا ملا کے علاوہ اس رجحان میں دخل سرسید کا بھی تھا۔ وہ خود ہندوستانی مسلمانوں سے کہتری اور انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی ذلت و پسماندگی کا احساس دور کرنے کی غرض سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنے کی تاکید زور شور سے کرتے رہتے تھے اور خود بھی انھوں نے یہ تہذیب اختیار کرلی تھی۔[1] اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بھی قوم کی تہذیب میں اگر کوئی چیز اچھی اور مفید ہو تو اس کا اختیار کرلینا نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے اس بنا پر اس میں شبہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں بعض ایسی خوبیاں ضرور ہیں جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے تھیں، لیکن سرسید کی انتہا پسندی یہاں بھی "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" کا مصداق ثابت ہوئی۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی نقالی میں ضروری اور غیر ضروری اچھے برے اور درست و نادرست کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ مغربی تہذیب کی مدح و ثنا اور اس کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی تنقیص و مذمت کے باب میں

---

[1] عہد گزشتہ میں علما میں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ بھی جلا وطنی کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو عجیب بات ہے وہ بھی سرسید کی طرح مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اختیار کرلینے کی دعوت دیتے تھے چنانچہ مجھ سے اکثر فرماتے تھے۔ سعید! میں تجھ سے بہت خوش ہوں لیکن اس بات سے سخت ناراض ہوں کہ تو مسلمانوں کے عہد جاگیرداری کا لباس پہنے پھرتا ہے اور کوٹ پتلون نہیں پہنتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید کا لب و لہجہ متوازن اور معتدل نہیں رہتا اور بسا اوقات اشتعال انگیز ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ سرسید جو کہتے تھے وہ بے اصل و بے بنیاد باتیں نہیں تھیں اور ان میں سے کتنی چیزیں ہیں جن کو آج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں نے بلکہ پورے عالم اسلام نے بے تکلف اختیار کر لیا ہے۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب کسی مسلمان کا ترکی ٹوپی اور ترکش کوٹ پہننا، علماء کے نزدیک اس کے ملحد اور بے دین ہونے کے لیے کافی تھا۔ پس جب فضا اس درجہ تیرہ و تار ہو تو ظاہر ہے سرسید کا نعرۂ مستانہ کس طرح برداشت ہو سکتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب و تمدن کے علم و نشان کے ساتھ جب ملک میں پھیلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی اس سلسلہ میں سرسید کی تقریریں اور تحریریں عام ہوئیں تو ملک میں کالج کے یورپین اساتذہ اور ساتھ ہی سرسید کے خلاف عام بیزاری اور غیظ و غضب کے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ اونچے اور سنجیدہ طبقہ میں ان جذبات کے سب سے بڑے ترجمان مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی تھے۔

مولانا شبلی نے تو ان خیالات کا اظہار چند خطوط، دو تین نظموں اور چند مضامین میں ہی کیا ہے اور وہ بھی اپنے آپ کو لیے دیئے ہوئے۔ لیکن اکبر بہت مشہور و مقبول شاعر تھے، سرسید کی تنقید میں جو مصرعہ بھی ان کی زبان قلم سے نکلتا۔ گھر گھر پھیل جاتا تھا۔ اکبر یوں سرسید کے بڑے مداح اور قدردان تھے لیکن سرسید کی حد سے زیادہ مغرب نوازی سے سخت بیزار اور بددل تھے چنانچہ سرسید پر ان کی تنقید کا رنگ یہ ہے فرماتے ہیں۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے — اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک — اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنون را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

ظاہر ہے جب یہ خیالات گھر گھر عام ہو رہے تھے تو کالج کے عمائد اور اس کے انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کب تک ان سے متاثر نہ ہوتے اور وہ بحیثیت ذمہ دار ممبر کے اپنا یہ فرض محسوس نہ کرتے کہ سرسید کی انتہا پسندی نے کالج میں جو جو حالات پیدا کر دیے ہیں ان کا تدارک کیا جائے۔

تعلیم خوش حال طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی

(ج) یہ سب تو خیر تھا ہی۔ سرسید کی پالیسی کا ایک عظیم نقصان یہ ہوا کہ چونکہ کالج کے یورپین اساتذہ یہاں بڑی بڑی تنخواہوں پر تھے اور کالج کے بجٹ پر ان کا غیر معمولی دباؤ پڑ رہا تھا اور ساتھ ہی کالج کے ساتھ اقامتی زندگی ضروری تھی جس کے فی نفسہ اہم اور مفید ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ سرسید ہر معاملہ میں کیمبرج اور آکسفورڈ کی نقالی کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانہ کے لفٹننٹ گورنر اور دوسرے بڑے بڑے انگریزوں سے دادِ تحسین حاصل بھی کیا۔ لیکن اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کی تعلیم مسلمانوں کے خوش حال طبقہ کے نوجوانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ جن کے والدین کالج کے گراں بار اخراجات کے متحمل ہو سکتے تھے۔ غریب طبقہ کے طالب علم کے لیے کالج سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے طلباء پر اگر آپ ایک نگاہ ڈالیں تو ان میں ایک عظیم اکثریت آپ کو

© rasailojaraid.com